

تکثیریت، کثیر المعنویت اور گوبی چند نارنگ

Pluralism, Multiplicity of Meaning and Dr. Gopi Chand Narang

محمد راشد سعیدی، پی۔ ایچ۔ ڈی اسکالر

شعبہ اُردو اقبالیات، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

لیاقت علی، ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ اُردو اقبالیات، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

Muhammad Rashid Saeedi, Ph.D Scholar
Urdu Department Iqbaliat, IUB, Bwp

Liaqat Ali, Associate Professor,
Urdu Department Iqbaliat, IUB, Bwp

Abstract:

Dr. Gopi Chand Narang is such a researcher, critic, linguist, and literary theorist related to Urdu whose relationship with pen and paper has been sustained for previous seventy years. Civilization, linguistics, stylistics, and critical theory has been his special field however, the sign of indigenous epistemology and ancient Indian philosophy can be felt across the lines in his dozens of writings. The most important and interesting characteristic of Dr. Gopi Chand Narang's criticism is Pluralism and Multiplicity of meaning. The Pluralism reflects the aspects of his personality and writings of being secular and humanitarian while multiplicity of meaning delineates his concept of meaning which is against the monoism and limitation in content interpretation. In this article Dr. Gopi Chand Narang's criticism has been studied in such a way that it becomes evident how he finds out multiplicity of meaning in his analysis of literary texts.

Keywords: Gopi Chand Narang, Pluralism, Multiplicity of meaning, Criticism, Secularism, Indigenous, Interpretation.

ملخص:

ڈاکٹر گوبی چند نارنگ اردو سے منسلک ایسے محقق، نقاد، ماہر لسانیات اور ادبی نظریہ ساز ہیں جن کا کاغذ قلم سے رشتہ گزشتہ ستر سالوں سے قائم ہے۔ تہذیب، لسانیات، اسلوبیات اور تنقیدی تھیوری اُن کے خاص میدان رہے ہیں، تاہم ان کی درجنوں تصانیف میں قدیم مقامی علمیات اور دانش ہند کے اثبات کی کوشش کو بین السطور محسوس کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر گوبی چند نارنگ کی تنقید کی سب سے اہم اور دلچسپ خصوصیت تکثیریت اور کثیر المعنویت ہے۔ تکثیریت ان کی ذات اور تحریروں کے سیکولر اور انسان دوست پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے جب کہ کثیر المعنویت ان کے تصورِ معنی کا احاطہ کرتی ہے جو کہ تعبیرِ متن میں معنی کی وحدت اور تحدید کے

خلاف ہے۔ اس آرٹیکل میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تنقید کا اس طور پر مطالعہ کیا گیا ہے کہ یہ بات آئینہ ہو جائے کہ وہ ادبی متون کے تجزیوں میں کس طرح کثیر المعنویت کا کھوج لگاتے ہیں۔

اردو تنقید کی عمر اگرچہ سو اسو سال سے زائد نہیں تاہم اس دورانیہ میں اردو ناقدین کی تعداد اس ہند سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان ناقدین کا ادبی و تنقیدی قد کاٹھ کتنا ہے؛ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کو مختلف تنقیدی دبستانوں اور تحریکوں کے خانوں میں بطریق احسن 'فٹ' کیا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک اس امر میں بھی کوئی قباحت نہیں کہ مستقل مزاجی، استقامت اور نظریے سے دائمی وفاداری کسی بھی شخص کے احسن خصائص ہوتے ہیں؛ تاہم ادب میں نقاد کوئی روایتی سیاسی کارکن نہیں ہوتا کہ اس کے نزدیک سوائے اپنی پارٹی کو حکومت میں لانے کے کچھ بھی اہم نہ ہو، بلکہ ادبی نقاد کے لیے سب سے اہم خصوصیت اس کا فکری ارتقاء ہے۔ اب اس صفت کے پیش نظر سوا صدی کی تنقیدی روایت کی فہرست سازی کی جائے تو اسماء نصف درجن سے بھی تجاوز نہ کریں۔ فکری ارتقاء کو پیش نظر رکھ کر اپنا تنقیدی سفر جاری رکھنے والے نقادوں کے سرخیل، بلا مبالغہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ گوپی چند نارنگ اردو کے ہر دبستان یا تحریک کے خانے کا وقار بڑھائیں گے چنانچہ کسی ایک تنقیدی دبستان سے جوڑ کر انہیں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

گوپی چند نارنگ (پیدائش: ۱۱ فروری ۱۹۳۱ء) ایک عظیم استاد ہونے ساتھ دانشور، محقق، مدون، نقاد، ماہر لسانیات اور تہذیبوں کے پارکھ بھی ہیں۔ تصنیف و تالیف سے اُن کا رشتہ ستر سال پرانا اور تاحال قائم ہے۔ تخلیق کار کو میدان چننے کے لیے زیادہ جتن نہیں کرنا پڑتے، وہ صلاحیت کو ودیعت سمجھ کر اُس کا ادراک کرتا ہے اور مزاج سے موافق صنف میں طبع آزمائی کرنے لگتا ہے، تاہم نقاد کا معاملہ اس سے یکسر جدا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ چاہتے تو پیش پا افتادہ راستوں ہی پر چلتے، روایتی تنقید لکھتے اور مرکز میں موجودگی کے سبب اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کرتے، لیکن انہوں نے پامال راستوں پر چلنے کی بجائے اُن دیکھی جہتوں کا سفر شروع کیا کہ اُن کی کتب کے موضوعات ان کی انفرادیت کا ثبوت ہیں۔ اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ (مقالہ ڈاکٹریٹ) سے شروع ہونے والے سفر نے اُن کی جہت متعین کر دی اور نتائج ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (۱۹۵۹ء)، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری (۲۰۰۳ء) اور اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب (۲۰۰۲ء) کی صورت برآمد ہوئے۔ تاہم نئے پن کی جستجو انہیں لسانیات اور اسلوبیات کی طرف لے گئی۔ کئی کلاسیکی متون کے لسانی تجزیات پیش کرنے کے بعد انہوں نے اہل اردو کو اسلوبیاتی تنقید کی جہت دکھائی اور اسلوبیاتِ میر (۱۹۸۵ء) ایسے منفرد اور تحیر آمیز مطالعات سے روشناس کیا۔ اگلا پڑاؤ ساختیات تھا۔ ساختیاتی مباحث کے تعارف کے حوالے سے اگرچہ گوپی چند نارنگ نے کسی قسم کی اولیت کا دعویٰ نہیں کیا تاہم ان سے پہلے پیش کیے گئے مضامین پر نظر دوڑائی جائے تو یا تو اُن کی نوعیت تشکیکی ہے یا معترضانہ۔ کسی نے ساختیاتی ڈسکورس کی تفہیم کرانے اور اس کا طلاق کر دکھانے کی باقاعدہ کوشش کی ہے تو وہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہی ہیں [1]۔ اس کے بعد قاری اساس تنقید ہو، پس ساختیات یا تھیوری کے کسی بھی نوعیت کے مباحث؛ گوپی چند نارنگ کے نقوش واضح اور انٹ نظر آتے ہیں۔

درج بالا سطور کو پڑھ کی یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ مغربی نظریات کے تعارف یا مشرقی تہذیب کی بازیافت کی کوشش سے کس نوعیت کی انفرادیت قائم ہوتی ہے؟ تو عرض ہے کہ گوپی چند نارنگ کی اولیں تصنیف ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں سے لے کر غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتہ اور شعریات

(۲۰۱۳ء) تک ہر کتاب میں مصنف کا ایک بنیادی تھیسز کار فرما ہے۔ کہیں اس تھیسز یا نظریے کی لود بھی ہے تو کہیں تیز۔ کہیں اسے واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے تو کہیں بین السطور اس کی موجودگی کا سُراغ ملتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کا یہ بنیادی تھیسز دراصل قدیم ہندوستانی تہذیبی جڑوں اور دانش ہند کا اثبات و اظہار ہے۔ متحدہ ہندوستان ہزاروں سال سے ایک شاندار تہذیب کا حامل رہا ہے جس میں فلسفہ اور ادب و فن سے متعلق علوم اور نظریات کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا بلکہ وہ نظریات حال کی نسبت قدرے ترقی یافتہ بھی تھے۔ ان تمام علوم و فنون سے معمور تہذیب کی جڑیں اس دھرتی میں اس قدر گہری ہیں کہ بقول گوپی چند نارنگ اس دھرتی سے نسبت رکھنے والا ذہن اور اس فکری رچاؤ کی حامل سر زمین میں خلق ہونے والا فن پارہ ان تہذیبی اثرات سے مکمل طور پر تہی نہیں ہو سکتا بلکہ اُس میں مذکورہ قدیمی اثرات کی نمو کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ [2]

”تکثیریت“ اور ”کثیر المعنویت“ دو ایسی اصطلاحیں ہیں جن کی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ان کی فکر سے گہری مناسبت ہے اور جو راقم کے لیے اس تحریر کا محرک بھی ثابت ہوئیں۔ تکثیریت سماجی مظہر ہے اور جمہوری ضرورت بھی۔ جب کہ کثیر المعنویت دورانِ قرأت ایک متن سے متنوع معانی برآمد کرنے کا طریق، منہج اور کیفیت ہے [3]۔ تکثیریت یعنی رنگارنگی، ہمہ جہتی اور بوقلمونی گوپی چند نارنگ کی شخصیت میں کئی طرح سے جلوہ گر ہے۔ ذکی (بلوچستان) میں پیدا ہونے، سرانجکی علاقے مظفر گڑھ (پنجاب) میں بچپن گزارنے کے بعد دہلی ہجرت اور مادری زبان سرانجکی ہوتے ہوئے اردو زبان کو بطور طرزِ زیست اپناتے ہیں اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں اردو کو متعارف کراتے ہیں۔ یہ تمام تجربے انفرادی اور اجتماعی طور پر جہاں گوپی چند نارنگ میں انفرادیت پیدا کر رہے تھے وہیں ان کی ذات میں ہمہ گوں تکثیریت بھی پیدا کر رہے تھے جو بعد ازاں ان کی ذات کا ناگزیر حصہ ثابت ہوئی۔

تکثیریت ہندوستان ایسے ہر ملک کے لیے جس میں مختلف النسل اور مختلف المذہب لوگ رہتے ہیں؛ از حد ضروری ہے۔ سیکولرزم اور جمہوریت تکثیری سماج کے لیے ناگزیر عنصر ہے اور امن و امان کے لیے لازم بھی۔ رنگ، نسل، مذہب، بنیاد، مہا بیانیے اور تکثیری سماج کے لیے فساد اور بد امنی کی بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ ہندوستان، فی زمانہ، تکثیری سماج کی سب سے بڑی مثال ہے۔ اس ملک میں مختلف نسلوں، رنگوں، مزاجوں اور مذاہن کے حامل لوگ اپنے اپنے مذاہب پر کاربند رہتے ہوئے زیست کرنے میں کوشاں ہیں۔ تاہم طاقت کا توازن اور عدم توازن یگانگت کو بے گانگی میں بدلنے کی سعی میں ناخوشگواریت کی حامل صورتِ حال کو جنم دیتا رہتا ہے۔ جس میں ہندوستان ہی سے متعلق، اسی میں پلے بڑھے ایک بڑے طبقے کے ساتھ؛ اسی ملک میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، جوان ہوئی اردو زبان بھی معنوب ٹھہرتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت امید امن کا استعارہ ثابت ہوتی ہے اور وہ بجاطور پر تکثیریت، جمہوریت اور سیکولر مزاج اردو زبان کے پیام بر کے طور پر سامنے آتے ہیں اور اردو کا دفاع کچھ اس طور پر کرتے ہیں:

”اردو کا ایک نام ’سیکولرزم‘ یعنی غیر فرقی واریت اور بقائے باہم بھی ہے۔ اردو نے صدیوں سے اس کی معنی خیز مثال قائم کر رکھی ہے اور ہر طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محافظ قائم باندھا ہے۔ لمحہ فکر یہ یہ ہے کہ کسی ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد جمہوری معاشرے نہ صرف یہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا

جواز فراہم کر سکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر زندہ بھی رہ سکتے ہیں“ [4]

جب جب اردو کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوتی ہیں گوپی چند نارنگ مدلل اور مبسوط انداز میں دفاع کرتے ہیں اور اردو کی انسان دوستی، رواداری اور وسیع المشربی ثابت کرتے ہیں۔ حق سلامت رکھے گوپی چند نارنگ کو کہ اُن کے بعد جب اردو کو فقط مسلمانوں کی زبان کہہ کر اُس کی تحدید کی جائے گی تو دفاع بھی بچارے مسلمانوں ہی کو کرنا پڑے گا۔

تکثیریت اور کثیر المعنویت؛ ہر دو کو فی زمانہ مابعد جدیدیت سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ تکثیریت اس بناء پر کہ مابعد جدیدیت ہر قسم کی مرکزیت کے خلاف آواز بلند کرنے اور لامرکزیت کو فروغ دینے کی دعویدار ہے، جس میں حاشیائی طبقات، موضوعات اور افکار کو مرکز میں جگہ دی جاتی ہے، جب کہ کثیر المعنویت سے تعلق کا سبب رولاں بار تھ (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۸۰ء) اور ژاک دریدا (۱۹۳۰ء۔ ۲۰۰۴ء) کے نظریات ہیں۔ پس ساختیات اور ردّ تشکیل کسی بھی متن میں معنی کی ادعائیت اور وحدت کے خلاف ہیں اور التوائے معنی کی بنیاد پر کثرت معنی اور کثرت تعبیر پر مصر ہیں۔ اس سے ادبی تنقید میں ایک طرف مصنف کی اجارہ داری پر ضرب پڑی تو دوسری طرف ہیئت پسندوں کے متن بنیاد طریق نقد کا رد ہوا جس نے متن کے تجزیے میں زبان اور زبان کے کلچر سے انسلاکات کا بھی رد کر دیا تھا۔

گوپی چند نارنگ جو ابتدا میں (ہندوستان بنیاد) جدیدیت کے ساتھ ٹھہرے تھے، جب زبان و ادب میں سے مصنف کے ساتھ قاری کی بے دخلی اور سماج اور سیاست سے منحرف ہو کے معنی آفرینی سے لاتعلقی دیکھی تو جدیدیت سے الگ ہو کر الگ راہ لی، کہ زبان مذہب سے تو بے بہرہ ہو سکتی ہے سماج سے ہر گز نہیں۔ ان کے بقول:

”اس سے شاید ہی انکار کیا جاسکے کہ ہم ایک نئی ثقافتی اور سماجی صورت حال کے روبرو ہیں، وہ لوگ جو معقولیت سے کام لیتے ہیں دیکھ سکتے ہیں کہ جدیدیت کے خوف، دہشت اور اجنبیت والے ایجنڈے سے، جو مغربی وجودیت کی اترن تھا اور خالص ہیئت پسندی سے جس نے اردو کو بڑی حد تک سماجی، ثقافتی ڈسکورس سے بے تعلق کر دیا تھا، نئی پیڑھی کے لکھنے والے علی الاعلان اس سے گریز کر کے نئے ڈسکورس سے جڑ چکے ہیں اور

اردو میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔“ [5]

معنی آفرینی یا کثیر المعنویت سے دلچسپی ادب اعلیٰ کے ساتھ قابل نقاد کی بھی اہم اور ناگزیر خصوصیت ہے۔ اکہری قرأت میں مکمل آشکار ہو جانے والا متن اعلیٰ ادب نہیں ہو سکتا، اسی طرح شرح و تعبیر میں معنی آفرینی کی صلاحیت سے محروم نقاد معتبر نہیں ہو سکتا۔ مسلسل ارتقائی ذہنیت کے حامل گوپی چند نارنگ نے تازہ مغربی مباحث سے مکمل آگہی کے بعد اسے اردو دنیا میں متعارف کرانے کی ٹھانی اور ساختیات کو بطور ایک علمی منطقے اور تنقیدی نظام کے طور پر متعارف کرایا، نہ صرف تعارف کرایا بلکہ ساختیات کے اطلاقی نمونے پیش کر کے ثابت بھی کیا کہ کس طرح ساختیات کلچر سے جڑ کر معنی اخذ کرتی ہے۔ ساختیات کے تعارف اور اطلاق کا یہی سلسلہ آگے بڑھا اور ہمیں پس ساختیاتی اور ردّ تشکیلی مضامین پڑھنے اور اپنی فکر کو انگینت کرنے کو ملے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی لسانیات سے دلچسپی انہیں معنی سے جڑے لسانی فلسفوں کی طرف لے گئی اور یوں اہل اردو کو تھیوری کے مباحث سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ یوں تو اُسی کی دہائی میں انہوں نے پس ساختیات اور ردّ تشکیل کے حوالے سے لکھنا

شروع کر دیا تھا تاہم ۱۹۹۳ء میں ان کی ہنگامہ خیز کتاب ساختیات ، پس ساختیات اور مشرقی شعریات منظر عام پر آئی۔ کتاب کے آغاز ہی میں اخذ قبول کے اعتراف کے باوجود بہتان لگے، فساد برپا ہوئے تاہم آج تک اس کتاب کی اہمیت کم نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں ساختیات، پس ساختیات اور ان سے جڑے تھیوری کے دیگر مباحث کا باقاعدہ تعارف کرایا گیا لیکن تعارف سے زیادہ اُس وقت کے عصری مباحث سے ہم آمیز کر کے چند پہلوؤں کے حوالے سے غلط فہمیوں کی نشاندہی کر کے باقاعدہ نظریہ سازی کی کوشش بھی کی گئی۔ اولاً متن اور قاری کو نظر انداز کر کے ساری توجہ مصنف پر مرکوز کر کے، کسی بھی طور حق ادب شناسی ادا نہیں کیا جاسکتا؛ یہ بات انہوں نے ۱۹۹۲ء میں طبع ہونے والی کتاب قاری اساس تنقید میں بھی واضح کر دی تھی، جسے بعد ازاں مکمل طور پر ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات میں شامل کر دیا گیا۔ ثانیاً متن کو قائم بالذات یا خود متکفی قرار دے کر اسے سماج اور کلچر سے یکسر جدا کر دینا بھی قرین انصاف نہیں۔ ثالثاً ادب کو مارکسزم جیسی کسی بھی آئیڈیالوجی کا ہتھکنڈا بنانا ادب کی روح کو مجروح کرنا ہے، تاہم آئیڈیالوجی کے بغیر بھی تخلیق ادب ممکن نہیں کہ یہ بھی سماج سے بیگانگی کی ایک صورت ہے [6]۔ یعنی گوپن چند نارنگ نے اردو کی ادبی صورت حال کے پیش نظر تھیوری سازی کی ایک متوازن کوشش کی جس میں متن، مصنف اور قاری کی تثلیث میں سے کسی ایک کا پلڑا بھاری کرنے کے بجائے ساتھ کلچر کا عنصر بھی شامل کر دیا کہ اہم تر عنصر ”متن“، کلچر ہی سے معنی اخذ کر کے اپنی اہمیت کا اثبات کرے گا۔ دیکھا جائے تو ادب فنی کے تمام ستونوں کو متوازن اہمیت دے کر گوپن چند نارنگ نے کثیر المعنویت کے دروازے کھول دیے ہیں۔ وہ متن، مصنف یا قاری؛ کسی ایک اساس تھیوری پر اصرار نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک ہر ایک سے حسب ضرورت معاونت لے کر معنی خیزی کے عمل کو جاری رکھا جاسکتا ہے۔ کشادہ فکری سے ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ تخلیقی آزادی اور معنیاتی تسلسل کا تحفظ وہی شخص کر سکتا جس کا اپنا ذہن تعینات اور تعصبات میں مقید نہ ہو۔ ڈاکٹر گوپن چند نارنگ نے تفہیم و تعبیر کے لیے متنوع دروازے کھول کر، تخلیقی عمل اور متن سے معنی آفرینی میں قاری کو شامل کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نظریہ کی ادعائیت اور حاکمیت کے بجائے طرفی خیال اور آزاد روی کے حامی ہیں۔

ساختیات ، پس ساختیات اور مشرقی شعریات کا ایک اہم اور منفرد ترین حصہ جسے ہنگامہ خیزی میں تقریباً فراموش کر دیا گیا وہ ”مشرقی شعریات“ کے مباحث پر مشتمل حصہ ہے۔ مشرقی شعریات کا جب ذکر چھڑے تو ذہن میں عربی و فارسی کے تنقیدی پیمانے در آتے ہیں۔ یعنی عربی و فارسی میں بیان و بدیع، فصاحت و بلاغت اور حرف و معنی سے متعلق مباحث؛ تاہم اس کتاب میں ڈاکٹر گوپن چند نارنگ نے مشرقی شعریات کے ضمن میں عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت بنیاد فلسفیانہ مباحث کو شامل کر کے سب کو مسرت آمیز حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اس ضمن میں انہوں نے سنسکرت تصور لسان پیش کیا اور خاص طور پر شونیہ، اپوہ، سپھوٹ، دھونی اور رس ایسے قدیم اور اہم نظریات کی نتیجہ خیز توضیحات پیش کر کے ادب کی تفہیم و تعبیر کے امکانات وسیع تر کر دیے۔ اگرچہ زمینی جڑوں میں فکری عظمت کی تلاش کا عمل نارنگ صاحب کے ہاں آغاز ہی سے جاری تھا تاہم نوے کی دہائی میں اسے ایک نظریہ کی شکل دے کر سامنے لایا گیا۔

فلشن کی تنقید کے حوالے ڈاکٹر گوپن چند نارنگ کا کام نہایت انفرادیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے ان کے کام کی نوعیت دو طرح سے ہے؛ ایک تو انہوں نے فلشن کو نظری طور پر نئی جہت دکھائی۔ دوسرا اہم فلشن نگاروں کی تخلیقات کے تجزیاتی مطالعات پیش کیے، جو یہاں ہماری توجہ کا مرکز ہیں۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل ان کی مرتبہ کتاب ہے جو افسانے کی پوری

روایت میں مضمیر فکر اور فن کو مربوط انداز میں عیاں کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کچھ پرانے اور نئے مضامین کا انتخاب فکشن شعریات، تشکیل و تنقید کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں طبع ہوا، جہاں ان کے فکشن سے متعلق افکار عیاں ہو جاتے ہیں۔ نظری حوالے سے انہوں نے اردو فکشن کو بیانیہ (Narratology) سے روشناس کیا۔ ان سے قبل فن افسانہ کو فقط، پلاٹ، کہانی اور کردار نگاری تک ہی محدود سمجھا جاتا تھا، بعض نقادوں نے بیانیہ کے حوالے سے بات کی بھی تو اسے فقط ایک تکنیک یا سادہ بیان ہی سمجھتا تھا۔ نارنگ صاحب نے اسے فکشن کی شعریات کا اہم ترین جزو قرار دیا جس میں مصنف، راوی اور متکلم کی تمام تر صورتوں، زمان و مکان اور آئیڈیالوجی کے برتاؤ اور اثرات کا بیان مضمیر ہے۔ فکشن کے تجزیاتی مطالعات کے لیے انہوں نے منٹو، بلونت سنگھ، بیدی اور انتظار حسین کے افسانوں کا انتخاب کیا ہے اور پس ساختیات، رد تشکیل ایسے طریقوں کو اپناتے ہوئے ان متون سے معانی کے جہان برآمد کیے۔ انہوں نے ان تخلیق کاروں کی تخلیقات کا انتخاب ان کی بین المتونیت کی خصوصیت کی بنا پر کیا ہے۔ تہذیب اور تخلیق کی روایت کے اثرات دھرتی کی جڑوں میں اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ وہ صدیوں تک آنے والے اذہان کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ بڑا تخلیق کار تاریخ، تہذیب، عصری سیاست، مصائب اور مسائل سے معنی اخذ کرتا ہے اور ان کو اس طرح بنتا ہے کہ ان کے متن میں تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے جو کثیر المعنویت اور کثرت تعبیر کا امکان پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک اساطیر، استعارات اور علامتیں دراصل وہ عناصر ہیں جو کسی بھی تخلیق کو معنیاتی حوالے سے ثروت مند بناتے ہیں۔ اب یہ نقاد کا فریضہ ہے کہ معنی کے سرچشموں تک رسائی حاصل کرے اور حقیقت عیاں کرے۔

افسانوی تجزیات کے حوالے سے پریم چند، منٹو، بیدی، بلونت سنگھ، سریندر پرکاش، اور انتظار حسین پر لکھے گئے مضامین اپنی نوعیت اور مطالعاتی منہج کے لحاظ سے نہایت منفرد ہیں۔ گوپی چند نارنگ ان سب افسانہ نگاروں کے افسانوں کو ان کے متن کی ظاہری پرت کے بجائے ان کے داخلی اور تشکیلی امکانات کو بنیاد بنا کر پرکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اشیا کو ان کے مظاہر کے بجائے تہذیبی جڑوں سے تعلق کی بنیاد پر جانچتے ہیں۔ بقول گوپی چند نارنگ:

”یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ادب میں کتنی ہی اور کیسی تبدیلیاں کیوں نہ آجائیں، ادب کا گہرا رشتہ اپنے اجتماعی لاشعور کے صدیوں پرانے، نسلی اثرات اور تہذیبی مزاج و افتاد طبع سے ضرور ہو گا۔ چنانچہ ایک ایسے معاشرے میں جو پنج تتر اور کھٹ امرت ساگر کی دھرتی سے تعلق رکھتا ہو اور جس کی ذہنی تشکیل میں الف لیلیٰ، طلسم ہوشربا اور حکایات گلستاں کا بھی حصہ رہا ہو۔۔۔ اس میں کہانی کتنی ہی کیوں نہ نئی ہو جائے وہ کہانی پن سے کلیتاً دامن کیسے چھڑا سکتی ہے۔“ [7]

ان کے نزدیک پریم چند کے افسانوں کی گرہ کشائی کے لیے فقط ترقی پسند عناصر پر انحصار کرنے کی بجائے پراکرتوں کی بناء پر تشکیل پانے والی عظیم روایت کو سمجھنا ہو گا۔ وہ بیدی کے فن کی استعاراتی جڑوں کو جانچنے کے لیے ہندو دیومالا اور پُرانوں کی تہذیب سے واقفیت لازم سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انتظار حسین کی تفہیم کے لیے ہندوستانی اساطیر کے ساتھ مشرق وسطیٰ کے قصص سے آشنائی ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ تخلیق کار ہیں جو استعارہ، تمثیل اور علامت کے بھید سے واقف ہونے کے بعد ان کے برتاؤ پر دسترس رکھتے تھے۔ جس وقت افسانے میں ترقی پسندی کی بنیاد پر حقیقت نگاری کا چلن عام تھا وہیں جدیدیت کے نام پر علامتی کہانی لکھی جا رہی تھی، جدیدیت سے فکری جڑت کے باوجود گوپی چند نارنگ نے ہر اس کہانی کو رد کیا جسے ادب کے دائرے میں لانا مشکل تھا، ان کے

نزدیک حقیقت نگاری یا علامت پسندی سے زیادہ اہم ان تخلیقات کی ادبیت تھی جو کہ اس وقت کے افسانوں میں مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ درحقیقت معنیاتی تہہ داری اور متن میں کثرت معانی کو سمونے کے لیے جس فن کارانہ دسترس کی ضرورت پیش آتی ہے اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا اور اس کے حصول کی کوشش سب سے اہم امر ہے۔ فن سے نا آشنا نام نہاد فنکاروں کی تخلیقات ایک طرف فنی تقاضوں سے عاری ہوتی تو دوسری طرف کثیر المعنویت سے تھی۔

گوپی چند نارنگ کا تکثیریت اور کثیر المعنویت سے تعلق فقط نظریہ یا افسانوی تنقید کی بناء پر نہیں بلکہ اُن کی شعری تنقید بھی اس معنی آفرینی اور معنی پاشی کے مسلسل عمل کی کھوج ہے۔ نارنگ صاحب کی زیادہ تر شعری تنقید لسانی، اسلوبیاتی اور تھیوری کے مباحث کے اطلاق پر مشتمل ہے، جس میں تہذیبی بازیافت اور دانش ہند کے اثبات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تنقید تفہیم و تعبیر ادب کا نام ہے اور ہر نظریہ نقد اسی عمل کی کوشش، اسی لیے گوپی چند نارنگ کسی ایک تنقیدی نظریے کو حتمی نہیں سمجھتے۔ اس حوالے سے بھی وہ تکثیریت اور ارتقا کے قائل ہیں اور کشادہ قلبی کا ثبوت بھی۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب میں انہوں نے اردو شاعری کے کئی تصورات کی بنیادوں کو ایرانی اور عربی کے بجائے ہند الاصل ثابت کیا۔ وہ ہند اسلامی لنگا جمنی تہذیب کے قائل ہیں اور اس تہذیب کے مرقعوں کی کھوج کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہبی شعور کی بہ نسبت جمالیاتی شعور انسان کو اندر سے زیادہ متاثر کرتا ہے اور جمالیاتی شعور کی جڑیں مقامیت اور مکانیت میں جڑی ہیں جن کے فروغ میں فنون لطیفہ کا کردار لائق تحسین ہے۔

”اسلوبیات میر“، ”اسلوبیات انیس“ اور اقبال کے کلام کا صوتیاتی نظام“ ایسے مضامین خالصتاً اسلوبیاتی تنقید کی مثال ہیں۔ ان مضامین میں انہوں نے اسلوبیاتی تنقید کی بناء پر فن پاروں کی لسانی ساخت کی پر تیں کھول کر ان شعراء کے جمالیاتی اور معنیاتی نظام تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ ان تجزیات میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اسلوبی تنقید فقط حرف شماری نہیں بلکہ اس کا فن کار کے جمالیاتی پہلوؤں سے گہرا تعلق ہو یہ تخلیقی جڑوں تک رسائی کے لیے معاون ہو سکتی ہے۔ اسلوبیات کے اطلاق اور مقاصد کے بابت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ یوں رقم طراز ہیں:

”ادبی تنقید معروضی بھی ہوتی ہے اور موضوعی بھی، اس لیے کہ تنقید کا مقصد ادب شناسی ہے اور ادب شناسی کا عمل خواہ وہ ذوقی ہو یا جمالیاتی یا معنویاتی، حقیقتاً تمام مباحث اس لسانی و ملفوظی کے پیکر کے حوالے سے ہوتے ہیں جس سے کسی بھی فن پارے کا

بحیثیت فن پارے کے وجود قائم رہتا ہے۔“ [8]

میر کے مطالعہ کے دوران میں انہوں نے میر کی شاعری کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو پہلے اس طرح نہ جانا گیا تھا؛ میر کی شعری طاقت دھرتی کی گہری جڑوں میں موجود ہے اور تہذیب سے گہرا تعلق ہی میر کی زبان کو ثروت مند بناتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی طبیعت میں موجود تجسس اور انفرادیت انھیں واحد معنی سے مفر کر کے نئے معانی کی کھوج میں ان دیکھی جہات میں لے جاتا ہے تاہم وہاں بھی وہ ربط اور انسلاک کو نظر انداز نہیں کرتے۔ سانسحہ کربلا بطور شعری استعارہ (۱۹۸۲ء) ان کی تنقیدی بصیرت اور کثیر المعنویت کی جستجو کی بہترین مثال ہے۔ اس میں انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ تخلیق کار کے پاس شعری تلازمات، علامتوں اور استعاروں کی صورت ایسی قوت ہوتی ہے جسے وہ مسلمہ تاریخی واقعات کو موضوعات بناتے ہوئے مروجہ لفظیات کو اس طرح برقیانے کے عمل سے گزارتے ہیں کہ لفظوں کے لغوی معانی اس تشکیل کردہ فضا میں، تخلیقی معنوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور نئے نئے معانی سے قاری کو واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

”فیض کو کیسے نہ پڑھیں“ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ایسا مضمون ہے جس میں پس ساختیات اور رد تشکیل کے اطلاق کو واضح طور دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں انہوں نے فیض کی نظم ”دستِ تہہ سنگ“ کی رد تشکیل کی ہے۔ فیض کی شخصیت اور کلام مشرقی جمالیات کی عکاسی ہے جو ان کی ذات کے اندر تک جذب ہے، اگرچہ بظاہر ان کی نظمیں مارکسی فکر کی عکاس ہو ا کرتی تھیں۔ نارنگ صاحب نے ثابت کر دکھایا کہ ترقی پسند معنی فیض کی نظم کی ایک اور ظاہری تہہ جب کے داخلی تہوں تک رسائی حاصل کر کے جمالیاتی اور تہذیبی معانی برآمد کیے جاسکتے ہیں۔ شافع قدوائی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے تنقیدی طریق، مقاصد اور انفرادیت کے بارے اپنی رائے کچھ یوں دیتے ہیں:

”مسئلہ خواہ ترقی پسند تصور ادب کا ہو یا جدیدیت کی فکری اساس کا یا فلکشن کی شعریات کی تشکیل کا یا پس ساختیاتی مباحث کے مختلف اصناف پر تخلیقی اطلاق کا، پروفیسر نارنگ نے ہمیشہ متن کے گہرے اور خیال انگیز تجربوں سے تنقید کا ایک تازہ کار نیا ماڈل اور محاورہ قائم کیا ہے جو تعمیم زدگی یا محظ نظری مباحث کی گونج سے آباد نہیں، بلکہ اُن کے یہاں بنیادی ہدف متن کا مرتکز آمیز مطالعہ ہے جس میں نہ صرف نئے علمییاتی اور فکری مباحث کی بصیرت ملتی ہے بلکہ وہ مختلف علوم کو محیط مبسوط اور جامع مطالعہ کو بروئے کار لاتے ہیں۔ نیز وہ ادراک معنی اور ترسیل معنی کی مختلف جہتوں کو تنقیدی وقتِ نظر کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔“ [9]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے فکری ارتقاء کا عروج اور اُس کا کامل اظہار اُن کی جس تصنیف میں نظر آتا ہے وہ غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات ہے۔ اس کتاب کو بجا طور پر اُن کا تنقیدی تکملہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ غالب کے حوالے سے قاری کے مروجہ تصورات کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ تنقیدی تھیوری کے حوالے سے نارنگ صاحب کا شعور ہو یا دانش ہند کی بابت ان کے نظریات؛ اس کتاب میں کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ کتاب مرزا غالب کی تعبیر نو ہے اور گذشتہ تمام تعبیرات سے یکسر جدا۔ اس میں انھوں نے غالب کی تعبیر میں دانش ہند، ویدانتی فلسفہ اور بودھ فکر کے ساتھ مابعد جدید تنقیدی تناظرات کو بھی برتا ہے۔ اس میں سے جس غالب کا ظہور ہوتا وہ کسی اور غالب شناس کے یہاں نظر نہ آسکا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ انہوں نے کلام غالب کے تجزیاتی مطالعے میں دانش ہند اور بودھی فکر کو بطور تناظر اختیار نہیں کیا بلکہ اسے سیاق کے طور پر برتا ہے۔ [10] عصری تنقید میں یہ چلن عام ہے اور اس میں نقاد کو سہولت کو بھی رہتی ہے کہ وہ کسی خاص فکر کو تناظر بنا کر اُس کا کسی فن پارے پر اطلاق کرے اور نئے معانی برآمد کرے تاہم کسی فکر کو سیاق بنانے میں تخلیق کار کی فکری جڑوں سے ان افکار کا تعلق ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے، اور یہی ادق اور بے مثل کام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کر دکھایا ہے۔ نارنگ صاحب کا بنیادی تھیسز جو اُن کی ہر تصنیف میں بین السطور موجود رہا، اس تصنیف میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات میں مرزا غالب کی فکری جڑیں مقامی ارضیت میں تلاش کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ ان کا رشتہ عجبت کی بجائے ہندوستانی دانش سے زیادہ گہرا تھا۔ انھوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ غالب کا بیدل سے متاثر ہو کر طرزِ بیدل اختیار کرنا، فارسی شعری دبستان سبکِ ہندی سے لگاؤ اور ویدانتی اور بودھی فکر سے دلچسپی ایسے عناصر ہیں جو غالب کی ذہنی جڑیں مقامیت میں پیوست ہونے کی دلالت کرتے ہیں۔ جدلیاتِ نفی اور بودھی فلسفی شونیتا سے غالب کو گہری

نسبت تھی۔ شوینٹا اور غالب کا مزاج ماورائیت کے بجائے ارضیت، مقامیت، انسان مرکز اور معنیاتی آزادی کو اساس بناتا ہے، اسی باعث یہ کلام غالب میں معنی آفرینی کا عمل جاری و ساری نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نارنگ:

”غالب کے تخلیقی ذہن و فکر میں غالب شعریات شوینٹا مماثل اس لیے ہے کہ بودھی فکر (شوینٹا) کی طرح یہ غیر ماورائی، انسان مرکز اور ارضیت اساس ہے۔ شوینٹا کی طرح اس کا مقصود یا منتہا بھی فقط آگہی و آزادی ہے۔ شوینٹا کی طرح یہ بھی بے لوث فریق ہے۔“ [11]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کثیر المعنویت اور کثیر الجہت تنقیدی طریق سے ثابت کر دکھایا کہ غالب کا منتہا معنیاتی حسن کاری اور آزادی و کشادگی کا احساس ہے۔ غالب اپنے کلام میں ہر ایک لفظ کو گنجینہ معنی کا طلسم سمجھتے تھے، لہذا ان کے لیے اکہرے اور واحد معنی کے حامل اشعار کہنا ممکن نہ تھا، وہ معنی کی تحدید، عمومیت اور تعینات کو پاش پاش کرنا چاہتے تھے، اس لیے غالب نے ایسی شعریات خلق کی جس میں معنی آفرینی، معنی پاشی، معنی ریزی اور معنی گستری کی سب طرفیں کھلی رہیں۔ غالب نے تخلیق کی بنیاد پر جس کثیر المعنویت کی راہ سنبھائی، تنقید کے میدان میں وہیں گوپی چند نارنگ کا مطمع نظر رہا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے تخلیق و ترسیل معنی میں ہمیشہ تعینات و تحدید کی مخالفت کی اور اپنے قاری کو ہمیشہ نئی جہتوں اور طرفوں کی طرف گامزن کیا۔ اس بناء پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تنقید کو تکثیریت اور کثیر المعنویت کی مسلسل جستجو کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

حوالہ جات

- 1- وہاب اشرفی، ”گوپی چند نارنگ کی ساختیاتی تنقید“، مضمولہ، عالمی اردو ادب، مدیر: نند کشور و کرم (دہلی: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، فروری ۲۰۰۸ء)، ص ۴۰۲۔
- 2- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۲۷۔
- 3- قاسم یعقوب، لفظ اور تنقید معنی (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۳۶۔
- 4- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو زبان اور لسانیات (دیباچہ) (رام پور: رام پور رضا لاہیری، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۶۔
- 5- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ (دہلی: اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء)، ص ۸۱۔
- 6- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۴۔
- 7- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو افسانہ روایت اور مسائل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء)، ص ۴۴۹۔
- 8- فضیل جعفری، ”گوپی چند نارنگ۔ اہم نقاد“، مضمولہ، عالمی اردو ادب، ص ۳۳۷۔
- 9- شافع قدائی، ”غالب تنقید کا نیا علمیااتی اور شعریااتی تناظر“، مضمولہ، گوپی چند نارنگ اور غالب شناسی، مرتبہ: دانش الہ آبادی (یوپی: بھدوہی، ۲۰۱۲ء)، ص ۸۳۔
- 10- ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ”غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شوینتا اور شعریات: ایک تاثر“، مضمولہ، تفہیم، مدیر: عمر فرحت (راجوری: تفہیم پبلی کیشنز، مئی تا دسمبر ۲۰۲۰ء)، ص ۳۵۔
- 11- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شوینتا اور شعریات (دہلی: ساہتیہ اکیڈمی، ۲۰۰۳ء)، ص ۷۶۔